اسرارِ خودی (طبع اول)___ متن کا تحقیقی مطالعہ

بصیرہ عنبرین

ABSTRACT:

This article analytically examines the text of "Asrar-e Khudi", Allama Iqbal's first book of Persian verse. In this regard, the last edition printed in Iqbal's life has been made the basis for examining the various changes incorporated by him over the years. More importantly, deviations from the handwritten manuscript and first edition have been highlighted. It not only brings to light the hardwork and labour which Iqbal put in but also the various stages through which the text has passed.

''اسرارخودی'' اقبال کا اولین مجموعۂ کلام ہے جو زبان فارسی میں شایع ہوا۔ یہ مثنوی کم و بیش دو برس کے عرصے میں مکمل ہوئی اور علامہ کے بنیادی نظریے یعنی 'تصور خودی' کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ اقبال نے یہ مثنوی اپنے والد بزرگوار شیخ نور محمد کی خواہش پر تحریر کی جو شیخ بوعلی قلندر پانی پتیؒ سے متاثر تھے اور اس بات کے خواہاں تھے کہ اقبال اپنے خیالات انھیں کے انداز میں رقم کریں۔ اس مثنوی پر مولانا رومؒ کے اثرات سے بھی انکار نہیں اور بلاشبہ انھیں کے تتبع میں اقبال نے حکایتی و ناصحانہ اسلوب بھی اپنایا اور اس مثنوی میں افرادِ ملت کی خودی سے بحث کی۔ ''اسرارخودی'' فرد کے احساس ذات کی عکاس ہے اور علامہ کے خیال میں یہ ملتِ اسلامیہ کے زوال کا اہم سبب تھا چناں چہ وہ اصلاح ملت کے لیے فرد کی اصلاح کو ضروری گردانتے ہیں۔

''اسرار خودی'' پہلی بار ۱۵ ستمبر ۱۹۱۵ء کو حکیم فقیر چشتی نظامی کی نگرانی میں چھپی اور اس کے اخراجات بھی انھوں نے برداشت کیے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۵۵ تھی اور اس اشاعت کے نسخے ۵۰۰ کی تعداد میں سامنے آئے جو اس وقت کے مطابق قلیل تعداد تھی۔[۱] ''اسرار خودی'' اس کا حتمی نام تھا جو اقبال کا تجویز کردہ تھا۔ یاد رہے کہ اس عنوان کی حتمی صورت طے کرنے سے قبل اقبالؒ، خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر اور دیگر احباب سے اس ضمن میں مشاورت کرتے رہے۔ اقبال کی طرف سے اس مثنوی کے کلام سے بھی اس اسم کی تصدیق ہوتی ہے۔ ''اسرارِ

خودی'' میں ''در بیان اینکہ اصلِ نظامِ عالم ازخودی است و تسلسل حیات تعیناتِ وجود بر استحکامِ خودی انحصار دارد'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است [۲]

موضوعاتی سطح پر دیکھیں تو یہ مثنوی عجمی تصوف کے ردِعمل کے طور پر سامنے آئی جو اقبال کے نظریے کے مطابق قوموں کو عمل کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے۔''اسرارِخودی'' اقبال کی ایک کلیدی مثنوی ہے اور یہاں اقبال نے فلاح ملت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے افلاطون اور حافظ کی فکر کو قوم کے لیے زہر قاتل قرار دیا۔ اقبال کے تصور خودی کے تمام تر نکات اس مثنوی سے مترشح ہیں۔ اس مثنوی سے واضح ہے کہ اقبال نے تصوف کی اصل روح قرآن سے دریافت کی، نیز تصوف سے استفادے کے سلسلے میں ایسے صوفیا کی جانب رجوع کیا جن کے ہاں انسان کے نائب حق ہونے پر تفاخر ملتا ہے اور جن کے ہاں خودی کے نقوش موثر طور پر تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے کلام میں مولانا رومؒ کے گہرے اثرات ہیں۔ فکرِ اقبال میں صوفیانہ حوالے سے ''پیوستن'' کے بجائے ''گستن'' پر زور دیا گیا ہے جو عین احساس خودی ہے۔ خالص اسلامی تصوف میں چوں کہ توحید یا تصور الہ مرکزی نقطہ ہے لہٰذا اقبال نے عجمی تصوف کے برخلاف وحدت الوجود کا ایراد کیا کہ ان کے نزدیک یہ عین رہبانیت ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو ''حالت سُکر'' پر اصرار کرتا ہے اور رہبانیت کی تبلیغ کر کے انسان کو سرتاسر جبری گردانتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تصوف ''حالتِ صحوٗ'' سے عبارت ہے اور خودی کا پیغام دیتا ہے۔ اقبال نے خودی کو ''تعیین ذات''(Self Evaluation) کا نام دیا اور طبع اول کے آغاز میں اس حوالے سے دیباچہ بھی تحریر کیا جو بعد ازاں بعض احباب کے اصرار پر حذف کر دیا گیا۔ اسی طرح مثنوی سے وہ شعر بھی نکال دیئے گئے جن سے افلاطون اور حافظ پر براہ راست تنقید تھی حالاں کہ وہ ابیات ترسیل مطلب میں معاون تھے۔''اسرارِخودی'' (طبع اول) میں شامل دیباچہ جو بعض اصحاب کے لیے غلط فہمی کا باعث بنا یہ تھا:

> ''یہ وحدت و جدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں یہ پُراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ ''خودی'' یا ''انا'' یا ''میں'' جو اپنے عمل کے رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کے رُو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہو گی جس کے حکما و علما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا

جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریبِ تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اُتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی۔

ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات و نظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوئی ہے۔ اس قوم کے موشگاف حکما نے قوتِ عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انا کی حیات کا یہ مشہودِ تسلسل جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے عمل سے متعین ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ انسانی انا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گذشتہ طریق عمل کا لازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ قانونِ عمل اپنا کام کرتا رہے گا وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔ انیسویں صدی کے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ جب انجیل یُوحنا کی پہلی آیت میں لفظ کلام کی جگہ لفظ عمل پڑھتا ہے (''ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ اور کلام ہی خدا تھا'') تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اسی نکتے کو دیکھتی ہے جس کو ہندو حکما نے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکما نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت یا بالفاظ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے اور بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیہ سے پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ کہ جب انا کی تعیین عمل سے ہے تو انا کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ ترکِ عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملّی پہلو سے نہایت خطرناک تھا اور اس بات کا مقتضی تھا کہ کوئی مجدّد پیدا ہو جو ترکِ عمل کی اصلی مفہوم کو واضح کرے۔ بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا۔ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دل فریب پیرایے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلی نہیں ہے۔ کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے بل کہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دل بستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری رام نُوج بھی اسی رستے پر چلے مگر افسوس ہے کہ جس عروسِ معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے، سری سنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔

مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغامِ عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سی لازوال ہو سکتی ہے مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں

مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب وغریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نکتہ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی، جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ شیخ اکبر کے علم وفضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ ان تھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحدالدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہوسکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے جزو اور کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے ''رگ چراغ'' میں ''خون آفتاب'' کا اور ''شرار سنگ'' میں ''جلوۂ طور'' کا بلاواسطہ مشاہدہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہندو حکما نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین وجمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا۔ علما قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکما میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ ملا محسن فانی کشمیری نے اپنی کتاب ''دبستان مذاہب'' میں اس حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے جس سے اس کے خیالات کا پورا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

شعراء میں شیخ علی حزیں نے یہ کہہ کر کہ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ حقیقت حال سے آگاہ تھے مگر باوجود اس بات کے ان کا کلام شاہد ہے کہ وہ اپنے گرد وپیش کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان حالات میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تخیل اپنے علمی ذوق کو محفوظ رکھ سکتا۔ مرزا بیدل علیہ الرحمۃ لذت سکون کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ ان کو جنبش نگاہ تک گوارا نہیں۔

''نزاکت ہا است در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را''

اور امیر مینائی مرحوم یہ تعلیم دیتے ہیں کہ:

''دیکھ جو کچھ سامنے آ جائے مُنھ سے کچھ نہ بول

آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا''

مغربی اقوام اپنی قوت عمل کی وجہ سے تمام اقوام عالم میں ممتاز ہیں اور اسی وجہ سے اسرار زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کے ادبیات وتخیلات اہل مشرق کے واسطے بہترین رہ نما ہیں۔ اگر چہ مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتدا ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظام وحدت الوجود سے ہوتی ہے لیکن مغرب کی طبائع پر رنگِ عمل غالب تھا۔ مسئلہ وحدت الوجود کا یہ طلسم جس کو ریاضیات کے طریق استدلال سے پختہ کیا گیا تھا دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہو گئے۔ جس طرح رنگ و بو وغیرہ کے لیے مختص حواس ہیں اسی طرح انسانوں میں ایک اور حاسہ بھی ہے جس کو حس ''واقعات'' کہنا چاہیے۔ ہماری زندگی واقعات گردوپیش کے مشاہدہ کرنے اور ان کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اس قوت سے کام لیتے ہیں جس کو میں نے ''حس واقعات'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے؟ نظام قدرت کے پراسرار بطن سے واقعات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر بیکن سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعات حاضرہ جن کو نظریات کے دلدادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے بہ نگاہِ حقارت دیکھتے ہیں اپنے اندر حقائق و معارف کا ایک گنجِ گراں مایہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں ''حس واقعات'' اور اقوام عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ''دماغ بافتہ'' فلسفیانہ نظام جو واقعات متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہوسکتا ہو۔ انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیات عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دِل و دماغ ان سے مستفید ہوکر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں۔

یہ ہے ایک مختصر خاکہ اس مسئلے کی تاریخ کا جو اس نظم کا موضوع ہے۔ میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ اس دیباچے سے اس نظم کی تفسیر مقصود نہیں۔ محض ان لوگوں کو نشان راہ بتانا مقصود ہے جو پہلے سے اس عسیر الفہم حقیقت کی دقتوں سے آشنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سطور بالا سے کسی حد تک یہ مطلب نکل آئے گا۔ شاعرانہ پہلو سے اس نظم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذتِ حیات ''انا'' کی انفرادی حیثیت اس کے اثبات استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ مسئلہ حیات مابعدالموت کی حقیقت کو سمجھنے کے

لیے بطور ایک تمہید کام دے گا۔

ہاں لفظ ''خودی'' کے متعلق ناظرین کو آ گاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا 'تعیین ذات' ہے۔ مرکب لفظ ''بیخودی'' میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے اور غالباً محسن تاثیر کے اس شعر میں بھی لفظ خودی کے یہی معنی ہیں:

''غریق قلزم وحدت دم از خودی نزند
بُود محال کشیدن میانِ آب نفس''

(محمد اقبال) ٣

''اسرارِ خودی'' کی پہلی اشاعت ١٩١٥ء پر نظر دوڑائیں تو یہاں طویل دیباچے کی شمولیت ہے اور حواشی کا اندراج مطلق نہیں ملتا جب کہ متن بھی بعض مقامات پر مختلف صورت میں ہے۔ بعد کی اشاعت میں نہ صرف اس اشاعت سے متن حذف کیا گیا بل کہ اضافی متن بھی شامل ہوا۔ مثال کے طور پر مثنوی کے آغاز میں مندرج نظیری کا شعر اور رومی کے معروف اشعار ع دی شیخ با چراغ ھمی گشت گردِ شہر۔۔۔الخ طبع اول میں شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح رومی کا شعر: دردرونم سنگ واندر سنگ نار+آب را برنارِ من نبود گداز___ جو بعد کی شایع شدہ صورت میں ''اسرارِ خودی'' میں ''حکایتِ شیخ و برہمن و مکالمۂ گنگا وہمالہ'' کے زیرِ عنوان ملتا ہے، طبع اول میں موجود نہ تھا۔ ان اشعارِ معروف سے قطع نظر بھی بہت سے مقامات پر متن مختلف صورت میں ملتا ہے جس کی نشان دہی اس مقالے کے حواشی میں کر دی گئی ہے۔ ''اسرار خودی'' کی اولین اشاعت کے آغاز میں مندرج چند اشعار بھی اس وقت فکری اعتبار سے غلط فہمی کا باعث بنے، چناں چہ دوسری اشاعت میں انھیں بھی نکال دیا گیا، شعر یہ تھے:

پیشکش بحضورِ سر سیّد علی امام مدظلہ العالی

اے امام! اے سیّد والا نسب — دُودمانت فخرِ اشرافِ عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی — عقلِ کُل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنیٔ بیگانۂ — جلوۂ شمعِ مرا پروانۂ
مُرغِ فکرم گلستانہا دیدہ است — از ریاضِ زندگی گُل چیدہ است
ایں گل از تارِ رگِ جاں بستہ ام — تازہ تر در دستِ تو گُلدستہ ام
بُود نقشِ ہستیم انگارۂ — ناقبولے ناکسے ناکارۂ
عشق سوہاں زد مرا آدم شدم — عالم کیف و کم عالم شدم
حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام — در رِگِ مہ دَورۂ خُوں دیدہ ام
بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست — تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
در درونِ کارگاہِ ممکنات — برکشیدم سّرِ تقویمِ حیات

من کہ ایں شب را چو مہ آراستم گردِ پائے ملّتِ بیضاستم
ملّتے در باغ و راغ آوازہ اش آتشِ دلہا سرود تازہ اش
ذرّہ کشت و آفتاب انبار کرد خرمن از صد رُومی و عطار کرد
در دلم رخت بر گردوں کشم گرچہ دُودم از تبارِ آتشم
خامہ ام از ہمّت فکرِ بلند رازِ ایں نہ پردہ در صحرا فگند
قطرہ تا ہم پایۂ دریا شود ذرّہ از بالیدگی صحرا شود
ملّت ار جسم است شاعر چشمِ اوست جسم را از چشمِ بینا آبروست
چشم از نُورِ محبت روشنم اشکبار از وردِ اعضائے تنم

نذرِ اشکِ بیقرار را ز من پذیر!
گریۂ بے اختیار از من پذیر! ۴

اسی طرح ''اسرارِخودی'' کے ایک اہم حصے ''درمعنی اینکہ افلاطونِ یونانی کہ تصوف و ادبیات اقوام اسلامیہ از افکارِ او اثرِعظیم پذیرفتہ بر مسلکِ گوسفندی رفتہ است و از تخیلّات او احتراز واجب است'' کے عنوان کو دیکھیں تو طبع اول میں اس کی صورت یوں تھی: ''در بیانِ اینکہ افلاطُونِ یونانی و حافظ شیرازی کہ تصوف و ادبیات اقوامِ اسلامیہ از تخیّلات ایشاں اثرِعظیم پذیرفتہ بر مسلک گوسفندی رفتہ اندواز ایشاں احتراز واجب است۔'' ۵جب کہ ''درحقیقتِ شعرو اصلاحِ ادبیات اسلامیۂ'' کے زیرعنوان تحریر کردہ طویل حصہ مکمل طور پرطبعِ اول میں موجود نہ تھا اور اس کے بجائے خودی کے مراحل شروع ہو جاتے ہیں۔۶''اسرارخودی'' کی اوّلین اشاعت میں اعراب کا اہتمام کیا گیا تھا، جو ان کی خطی بیاض سے بھی قریب تر ہے۔ بعد کی اشاعت میں اس میں بھی کافی تبدیلیاں ملتی ہیں۔ مذکور تبدیلیوں کے ساتھ لفظیات و تراکیب کے سلسلے میں بھی کچھ ترمیمات و اصلاحات ملتی ہیں، جن کی تصدیق اس مجموعے کی بیاض سے موازنہ کرتے ہوئے بھی ہو جاتی ہے۔ مذکور تبدیلیوں سے ہمراہ ''اسرارخودی'' کی یہ دوسری اشاعت ۱۹۱۸ء میں سامنے آئی۔ ''اسرارخودی'' کی تیسری اشاعت جس میں لفظی حوالے سے مزید تغیرات ملتے ہیں، ''رموز بےخودی'' کے اشتراک سے سامنے آئی اور ۱۹۲۳ء میں ''اسرار و رموز'' (یک جا) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ''اسرار و رموز'' (ہردویکجا) مطبوعہ ۱۹۲۳ء میں مختصر اردو دیباچے کے بجاے ایک مختصرتر دیباچہ، شامل ہوا جس کے تحت علامہ نے وضاحت کی کہ ناظرین کی سہولت کے لیے دونوں مثنویاں یکجا شایع ہو رہی ہیں۔معمولی ترمیمات کے علاوہ مزید تشریح کے لیے کم وبیش سو، سوا سو اشعار کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اسی طرح کچھ مقامات پر نئے الفاظ میں تاہم کتاب کی مجموعی ترتیب میں کوئی فرق نہیں۔ اقبال کی وفات کے بعد ۱۹۴۰ء میں اس کا ایک ایڈیشن شائع ہوا جس کے نگران چوہدری محمد حسین تھے اور جس میں مذکور تین اشاعتوں اور بیاض سے اختلافات دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی اشاعت مطبع شیخ غلام علی اینڈ سنز سے ہوئی اور یہ نسخہ عمومی طور پر''اسرارِخودی'' کی قدیم اشاعت (مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز) کے نام سے جانا جاتا ہے۔اسی طرح جسٹس جاوید اقبال مرحوم نے اقبال کی وفات کے پچاس

سال مکمل ہونے پر''اسرارِخودی'' کی نئی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور یہ صورت بھی شیخ غلام علی اینڈ سنز ہی کے مطبع سے چھپی، اس صورت میں یہ شایع شدہ جدید اڈیشن شمار کیا جاتا ہے۔ اسی اشاعت کے عکوس مختلف اداروں نے بھی شایع کیے اور تسلسل کے ساتھ شایع ہو رہے ہیں۔''اسرارخودی'' کی ایک اور اشاعت اقبال اکادمی، پاکستان سے نئی کتابت کی صورت میں شائع ہوئی۔ ان قابل ذکر اشاعتوں کے علاوہ بھی''اسرارِخودی'' متعدد اداروں سے بارہا چھپ چکی ہے۔

یہ مقالہ''اسرار خودی'' کی اوّلین طباعت کے تحقیقی مطالعے پر مبنی ہے۔یہاں''اسرارِخودی'' کی تیسری اشاعت''اسرارورموز''(ہر دو یکجا)،مطبوعہ۱۹۲۳ء جو حیات اقبال میں بالترتیب آخری ہے، بنیادی متن کے طور پر پیش ہے۔مقالے میں اس کے صفحات نمبر کا اندراج متن کے ساتھ قوسین میں کر دیا گیا ہے اور اس سے طبع اول کے متنی انحرافات، رموزِ واوقاف کے تغیّرات،مشمولات متن اور حواشی کی موجودگی و عدم موجودگی پر مبنی انحرافات زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔واضح رہے کہ یہ تمام تر مقائسہ و موازنہ کرتے ہوئے''اسرارِخودی'' کے تمام تر متن کے اندراج کے بجائے صرف وہ اشعار تحریر کیے گئے ہیں جن کا متن طبع اول میں مختلف صورت میں ہے تاکہ طوالت سے گریز ہو سکے۔ چناں چہ ان اشعار کو متن کی تفہیم کرتے ہوئے مدنظر نہ رکھا جائے تاکہ معنوی ابہام نہ پیدا ہو۔ یہ متن تقابل وموازنہ پر مبنی حواشی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

نیست در خشک و ترِ بیشہءِ من کوتاہی چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم [۷]
(ص۳)

خوگرِ من نیست چشمِ ہست و بود [۸] لرزہ بر تن خیزم از بیمِ نمود
(ص۴)

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم من نوائے شاعرِ فرداستم [۹]
(ص۵)

رخت باز از نیستی بیروں کشید [۱۰] چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید
(ص۵)

نالہ را اندازِ نَو ایجاد کن بزم را از ہاے و ہو آباد کن [۱۱]
(ص۹)

قطرہ تا ہمپایہَ دریا شود ذرّہ از بالیدگی صحرا شود [۱۲]
(ص۱۱)

فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت خامہَ من شاخِ نخلِ طور گشت [۱۳]
(ص۱۱)

وانمودن خویش را خوئے خودی است خفتہ در ہر ذرّہ نیروئے خودی است [۱۴]

(ص۱۴)

قوّتِ خاموش و بیتابِ عمل　　　از عمل پابندِ اسبابِ عمل [۱۵]

(ص۱۴)

گرچہ پیکر می پذیرد جامِ مے　　　گردش از ما وام گیرد جامِ مے [۱۶]

(ص۱۴)

کوہ چوں از خود رود صحرا شود　　　شکوہ سنجِ جوششِ دریا شود [۱۷]

(ص۱۴)

سبزہ چوں تابِ دمید از خویش یافت　　　ہمّتِ او سینۂ گلشن شگافت [۱۸]

(ص۱۵)

چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست　　　می کشاید قلزمے از جوئے زیست [۱۹]

(ص۱۵)

آرزو را در دلِ خود زندہ دار　　　تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار [۲۰]

(ص۱۶)

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو است　　　فطرتِ ہر شے امینِ آرزو است [۲۱]

(ص۱۶)

اے بروں از نیستاں آباد شد　　　نغمہ از زندانِ او آزاد شد [۲۲]

(ص۱۷)

چیست نظمِ قوم و آئین و رسوم　　　چیست رازِ تازگیہائے علوم [۲۳]

(ص۱۷)

دست و دندان و دماغ و چشم و گوش[۲۴]　　　فکر و تخیل و شعور و یاد و ہوش

(ص۱۷)

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم [۲۵]

(ص۱۸)

عاشقانِ او ز خوباں خوب تر　　　خوشتر و زیبا تر و محبوب تر [۲۶]

(ص۱۹)

دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید[۲۷]　　　چادرِ خود پیشِ روئے او کشید

(ص۲۱)

در تپیدِ دمبدم آرامِ من　　　گرم تر از صبحِ محشر شامِ من [۲۸]

(ص۲۲)

خستگیہائے تو از ناداری است   اصل دردِ تو ہمیں بیماری است ۲۹

(ص۲۴)

رفت آں درویش سرافگندہ پیش   غوطہ زن اندریم افکارِ خویش ۳۰

(ص۲۷)

نامۂ آں بندۂ حق دستگاہ۳۱   لرزہ ہا انداخت در اندامِ شاہ

(ص۲۸)

شیرہا از بیشہ سر بیروں زدند   بر علف زارِ بُزاں شب خوں زدند ۳۲

(ص۳۰)

نیست ممکن کز کمالِ وعظ و پند   خوئے گرگی آفریند گوسفند ۳۳

(ص۳۱)

صاحبِ آوازۂ الہام گشت   واعظِ شیرانِ خوں آشام گشت ۳۴

(ص۳۱)

ذرّہ شو صحرا مشو گر عاقلی!   تا ز نورِ آفتابے برخوری ۳۵

(ص۳۲)

خیلِ شیر از سخت کوشی خستہ بود   دل بذوقِ تن پرستی بستہ بود ۳۶

(ص۳۳)

آمدش ایں پند خواب آور پسند   خورد از خامی فسونِ گوسفند ۳۷

(ص۳۳)

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم۳۸   از گروہِ گوسفندانِ قدیم

(ص۳۴)

قومہا از سُکرِ او مسموم گشت   خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت ۳۹

(ص۳۶)

مست زیرِ بارِ محمل می رود   پائے کوباں سوئے منزل می رود ۴۰

(ص۴۵)

باد را زنداں گُلِ خوشبو کند   قید بو را نافہء آہو کند ۴۱

(ص۴۵)

لالہ پیہم سوختن قانونِ او   بر جہد اندر رگِ او خونِ او ۴۲

(ص۴۶)

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مرو ۴۳؎
(ص۴۶)

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است بر عناصر حکمران بودن خوش است ۴۴؎
(ص۴۹)

طبعِ مضموں بندِ فطرت خوں شود تا دو بیتِ ذاتِ او موزوں شود ۴۵؎
(ص۵۱)

از وجودِ تو سر افرازیم ما پس بہ سوزِ ایں جہاں سازیم ما ۴۶؎
(ص۵۲)

نرگسم وارفتۂ نظّارہ ام در خیابانش چو بو آوارہ ام ۴۷؎
(ص۵۲)

فکرِ گردوں رس زمیں پیما ازو چشم کور و گوش ناشنوا ازو ۴۸؎
(ص۵۳)

مرد کشور گیر از کرّاری است گوہرش را آبرو خودداری است ۴۹؎
(ص۵۳)

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات لذّتِ تخلیق قانونِ حیات ۵۰؎
(ص۵۴)

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم زورِ خود را از مہمّاتِ عظیم ۵۱؎
(ص۵۵)

مُدّعی گر مایہ دار از قوّت است دعوٰے او بے نیاز از حجّت است ۵۲؎
(ص۵۷)

خاکِ پنجاب از دم او زندہ گشت صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت ۵۳؎
(ص۵۷)

داستانے از کمالش سر کنم گلشنے در غنچۂ مضمر کنم ۵۴؎
(ص۵۸)

قطرہ سخت اندام و گوہر خو نبود ریزۂ الماس بود و او نبود ۵۵؎
(ص۶۲)

پختہ فطرت صورتِ کہسار باش حاملِ صد ابرِ دریا بار باش ۵۶؎

(ص۶۲)

مشت خاکے اصلِ سنگِ اسود است　　کو سر از جیبِ حرم بیروں زد است ۵۷؎

(ص۶۴)

در بنارس برہمنے محترم　　سر فرو اندریمِ بود و عدم ۵۸؎

(ص۶۵)

کوہ چوں ایں طعنہ از دریا شنید　　ہم چو بحرِ آتش از کیں بر دمید ۵۹؎

(ص۶۷)

از تو قلزم گدیۂ طوفاں کند　　شکوہ ہا از تنگیِ داماں کند ۶۰؎

(ص۶۹)

خانہ سوزِ محنتِ چل سالہ شو　　طوفِ خود کن شعلۂ جوّالہ شو ۶۱؎

(ص۷۴)

آگہی از قصّۂ اخوندِ روم　　آنکہ داد اندر حلب درسِ علوم ۶۲؎

(ص۷۴)

سوزِ شمس از گفتۂ مُلّا فزود　　آتشے از جانِ تبریزی کشود ۶۳؎

(ص۷۵)

آتشِ دل خرمنِ ادراک سوخت　　دفترِ آں فلسفی را پاک سوخت ۶۴؎

(ص۷۷)

آتشے دارد مثالِ لالہ سرد　　شعلۂ دارد مثالِ ژالہ سرد ۶۵؎

(ص۷۹)

دیدہ ہا بے نور مثلِ نرگس اند　　سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند ۶۶؎

(ص۸۰)

در کفِ موسےٰ ہمیں شمشیر بود　　کارِ او بالاتر از تدبیر بود ۶۷؎

(ص۸۰)

سینۂ دریائے احمر چاک کرد　　قلزمے را خشک مثلِ خاک کرد ۶۸؎

(ص۸۱)

تو کہ از اصل زماں آگہ نۂ　　از حیاتِ جاوداں آگہ نۂ ۶۹؎

(ص۸۲)

نکتۂ می گویمت روشن چو دُر　　تا شناسی امتیازِ عبد و حُر ۷۰؎

(ص۸۴)

از خمِ حق بادۂ گلگوں زدیم | بر کہن میخانہ ہا شبخوں زدیم [۱]
(ص۸۴)

عصرِ نو از جلوہ ہا آراستہ | از غبارِ پائے ما برخاستہ [۲]
(ص۸۷)

کوہِ آتش خیز کن ایں کاہ را | ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را [۳]
(ص۸۷)

ما پریشاں در جہاں چوں اختریم | ہمدم و بیگانہ از یک دیگریم [۴]
(ص۸۷)

باز ما را بر ہماں خدمت گمار | کارِ خود با عاشقانِ خود سپار [۵]
(ص۸۸)

آفتاب از سوزِ او گردوں مقام | برقہا اندر طوافِ او مدام [۶]
(ص۸۸)

موج در بحر است ہم پہلوئے موج | ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج [۷]
(ص۸۹)

من مثالِ لالۂ صحراستم | در میانِ محفلے تنہاستم [۸]
(ص۸۹)

حواشی:

۱۔ ملاحظہ کیجیے اسرارِ خودی بہ اہتمام حکیم فقیر محمد چشتی نظامی، لاہور: یونین سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۵ء
۲۔ ایضاً، ص۲۰۔
۳۔ ،،، ص ا ___ ل
۴۔ ،،، ص،ا تا ۴۔
۵۔ ،،، ص۶۲۔
۶۔ ،،، ص۲ے۔۳ے۔
۷۔ طبع اول میں نظیری نیشاپوری کا متضمن شعر شامل نہیں، دیکھیے آغاز کا حصہ۔
۸۔ طبع اول میں اس شعر کے مصرعِ ثانی میں 'بیمِ نمود' کے بجائے 'خوفِ نمود' کے الفاظ ہیں، دیکھیے، ص ۷۔

۹ طبع اول میں شعر اس صورت میں ہے: بے نیاز از گوش امروز آمدم + من صدائے شاعرِ فرداستم ،ص ۸۔
۱۰ طبع اول میں 'ق' (قطعہ بند ابیات) کا آغاز اسی شعر سے ہوتا ہے، دیکھیے ،ص ۹۔
۱۱ طبع اوّل میں اس کے بعد یہ شعر درج ہے: رُوحِ نَو می جوید اجسامِ کہن + کمتر از قُم نیست اعجاز سخن، دیکھیں ،ص ۱۷۔
۱۲ طبع اول میں گیارہ ابیات پر مبنی یہ پورا بند شامل نہیں ہے۔
۱۳ طبع اول میں اس کے بعد یہ شعر بھی ہے: دیدہ از خاکِ عجم نورانی است + لاجرم طرزِ نگہ تُو رانی است، دیکھیے ،ص ۱۹۔
۱۴ طبع اول میں اس شعر کے بعد اُوپر مندرج حوالہ نمبر ۲۵ کے تحت بتایا گیا شعر ملتا ہے، دیکھیے ،ص ۲۴
۱۵ طبع اول میں اس بند کا آخری شعر یہ ہے: خیزد، انگیزد، فتد، تابد، دمد + سوزد، افروزد، خرامد، پَر زند (دیکھیے ،ص ۲۴) جب کہ اسرار و رموز (ہر دو یکجا) میں خاتمہ بند کے طور پر لایا گیا شعر ترتیب میں اس سے قبل درج ہے۔
۱۶ طبع اول میں مصرع ثانی یوں ہے: جُنبش از ما وام گیرد جامِ مے ،ص ۲۵۔
۱۷ طبع اول میں مصرع ثانی میں 'جوششِ دریا' کے بجائے 'یورشِ دریا' کی ترکیب مرقوم ہے، ملاحظہ کریں ،ص ۲۵۔
۱۸ طبع اول میں مصرع اول میں 'تابِ دمید' کے بجائے 'تابِ نمو' کے الفاظ ہیں۔ دیکھیے ،ص ۲۶۔
۱۹ طبع اول میں یہ شعر موجود نہیں بل کہ خاتمۂ بند کے طور پر ذیل کا شعر درج ہے: زندگی محکم ز ایقاظِ خودی است + کاہد از خوابِ خودی نیروئے زیست ،ص ۲۷۔
۲۰ طبع اول میں تیسرا شعر اس حصے کے آخر میں درج ہے۔ دیکھیے ،ص ۳۲۔
۲۱ طبع اول میں چوتھا شعر بھی اسی بند کے آخر میں ہے۔ دیکھیے ،ص ۳۲۔
۲۲ طبع اوّل میں یہ بیت مختلف شکل میں ہے اور یوں ہے: اے بروں از نیستاں آئینِ خویش + نغمہ از لذّتِ تعیینِ خویش ،ص ۳۰۔
۲۳ طبع اوّل میں مصرع دوم اس طرح ہے: چیست رازِ اختراعاتِ عُلُوم ۔ص ۳۰۔
۲۴ طبع اول میں مصرع اول یوں ہے: بینی و دست و دماغ و چشم و گوش ،ص ۳۱۔
۲۵ طبع اول میں یہ خاتمے کا شعر نہیں بل کہ اس کے بعد بند کے آغاز میں درج تیسرا اور چوتھا بیت بالترتیب لایا گیا ہے۔ خاتمۂ بند کے طور پر کوئی شعر شامل نہیں، دیکھیے ،ص ۳۱۔
۲۶ طبع اول میں اس شعر کا مصرع ثانی یوں ہے: از حسینانِ جہاں محبوب تر، دیکھیے ،ص ۳۵۔
۲۷ طبع اول میں یہ مصرع اس صورت میں ہے: چُون نبی دُختر چہ را بے پردہ دید، دیکھیے ،ص ۳۸۔
۲۸ طبع اول میں مصرعِ اولیٰ میں 'دمبدم' کے بجائے 'مُتّصل' کا لفظ رقم ہے۔ دیکھیے ،ص ۴۰۔
۲۹ طبع اول میں دوسرا بیت یوں ہے: جُملہ اسقامِ تو از ناداری است + اصلِ علّت ہا ہمیں بیماری است ،دیکھیے ،ص ۴۳۔
۳۰ طبع اول میں مصرعِ دوم یوں ہے: غرق اندر قُلزمِ افکارِ خویش، دیکھیے ،ص ۵۰۔
۳۱ طبع اوّل میں یہ مصرع اس صورت میں ہے: نامۂ آں صُوفیِ حق دستگاہ۔ دیکھیے ،ص ۵۱۔
۳۲ طبع اوّل میں شعر یوں ہے: شیر ہا از بیشہ سر برزدند + بر حصارِ گوسفنداں تاختند، دیکھیے ،ص ۵۴۔
۳۳ طبع اوّل میں مصرع ثانی یہ ہے: رنگِ سبعّیت پذیرد گوسفند، دیکھیے ،ص ۵۶۔
۳۴ طبع اوّل میں اس مصرع کا اوّلین لفظ 'صاحب' کے بجائے 'مہبط' ہے۔ دیکھیے ص ۵۶۔

۳۵ـ طبع اوّل میں مصرعِ ثانی یوں ہے: تا ز فیضِ نیرّ ے تاباں شوی، دیکھیے ص ۵۸۔

۳۶ـ طبع اول میں یہ شعر مکمل صورت میں یوں ہے: قومِ شیراز فتحِ پیہم خستہ بود + دِل بذوقِ استراحت بستہ بود، دیکھیے ص ۵۹۔

۳۷ـ یہ شعر طبع اول میں اس صورت میں درج ہے: آمدش ایں وعظِ خواب آور پسند + گشت مسحُور از کلامِ گوسفند، دیکھیے ص ۵۹۔

۳۸ـ طبع اول میں مصرع اولیٰ میں ’دیرینۂ‘ کے بجائے ’اول‘ مرقوم ہے اور ’افلاطون‘ با اعلانِ نون آیا ہے۔ دیکھیے، ص ۶۲۔

۳۹ـ طبع اوّل میں اس شعر کے مصرعِ ثانی میں ’ذوقِ عمل‘ کے بجائے ’لطفِ عمل‘ کی ترکیب ہے، دیکھیے ص ۶۶۔ علاوہ ازیں اس شعر پر اس حصے کا خاتمہ نہیں ہوتا بل کہ ایک پورا بند حافظؔ کے حوالے سے مرقوم ہے، بند دیکھیے:

هوشیار از حافظِ صہبا گسار جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
رہنِ ساقی خرقۂ پرہیزِ اُو مَے علاجِ ہَولِ رستاخیز او
نیست غیر از بادہ در بازار او از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چُوں خراب از بادۂ گلگوں شود مایہ دارِ حشمتِ قاروں شود
مُفتیِ اقلیمِ او مینا بدوش محتسب ممنونِ پیرِ مے فروش
طَوفِ ساغر کرد مثلِ رنگِ مَے خواست فتوٰے از رباب و چنگ و نے
در رموزِ عیش و مستی کاملے از خُمِ خُوں در دلے پا در گلے
رفت و شُغلِ ساغر و ساقی گذاشت بزمِ رندان و مَے باقی گذاشت
چُوں جرس صد نالۂ رسوا کشید عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
در محبّت پیروِ فرہاد بُود بر لبِ اُو شُعلۂ فریاد بود
تخمِ نخلِ آہ در کُہسار کاشت طاقتِ پیکار با خسرو نداشت
مُسلم و ایمانِ او زُنّار دار رخنہ اندر دینش از مژگانِ یار
آنچناں مستِ شرابِ بندگی است خواجہ و محرومِ ذوقِ خواجگی است
’’دعویٰ اونیست غیر از قال و قیل‘‘ ’’دستِ او کوتاہ و خُرما بر نخیل‘‘
آں فقیہِ ملّتِ مَی خوارگاں آں امامِ اُمّتِ بیچارگاں
گو سفند است و نوا آموخت است عشوہ و ناز و اَدا آموخت است
دلربائیہائے او زہر است و بس چشمِ او غارتگرِ شہر است و بس
ضُعف را نامِ توانائی دہد سازِ او اقوام را اغوا کند
اُز بُزِ یونان زمیں زیرکتر است پردۂ عودش حجابِ اکبر است
نغمۂ چنگش دلیلِ انحطاط ہاتفِ او جبرئیلِ انحطاط
بگدز از جامش کہ در مینائے خویش چُوں مریدانِ حسن دارد حشیش
از تخیل جنّتے پیدا کند مر ترا بر نیستی شیدا کند
ناوک اندازے کہ تاب از دل برد ناوکِ او مرگ را شیریں کند

مارِ گُلزارے کہ دارد زہرِ ناب | صَید را اوّل ہمی آرد بخواب
عشق با سحرِ نگاہش خود کشی است | کُشتنش مشکل کہ مارِ خانگی است
حافظِ جادو بیاں شیرازی است | عُرفیِ آتش زباں شیرازی است
ایں سُوئے ملکِ خودی مرکب جہاند | آں کنارِ آبِ رُکن آباد ماند
اِیں قتیلِ ہمّتِ مردانۂ | آں ز رمزِ زندگی بیگانۂ
دستِ ایں گیرد ز انجم خوشۂ | چشمِ آں از اشک دار و توشۂ
روزِ محشر رحم اگر گوید بگیر | عُرفیا! فردوس و حورا و حریر
غیرتِ او خندہ بر حُورا زند | پُشتِ پا بر جنۃُ الماوٰے زند
بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز | زندۂ؟ ار صحبتِ حافِظ گریز
ایں فسوں خواں زندگی از ما رُبود | جامِ او شانِ جمی از ما رُبود

دیکھیے، فرقہ باطنیہ، ص۶۶ تا ۷۲۔

۴۰ طبع اول میں مصرع یوں ہے: راکب و سامان ومحمل می برد، دیکھیے، ص۷۴۔

۴۱ طبع اول میں اس مصرعے میں لفظ 'زنداں' اعلانِ نون کے ساتھ ہے۔ دیکھیے، ص۷۵۔

۴۲ طبع اول میں مصرع دوم یوں ہے: رقص پیرا در رگِ اُو خونِ او، دیکھیے، ص۷۵۔

۴۳ طبع اوّل میں مصرع دوم میں 'مصطفےؐ' کے بجائے 'زندگی' کا لفظ مرقوم ہے، دیکھیے، ص۷۶۔

۴۴ طبعِ اوّل میں لفظ 'حکمران' میں اعلانِ نون نہیں۔ دیکھیے، ص۸۱۔

۴۵ طبع اوّل میں پہلا مصرع یوں ہے: طبع فطرت عُمر ہا درخوں تپد، ص۸۵۔

۴۶ طبع اول میں مصرعِ ثانی یوں ہے: پسِ بآلامِ جہاں سازیم ما، دیکھیے، ص۸۷۔

۴۷ طبع اولِ میں مصرع ثانی اس طرح ہے: در ریاضِ اُو چو بُو آوارہ ام، دیکھیے، ص۸۸۔

۴۸ مصرع ثانی، طبع اول میں اس صورت میں ہے: دیدہ اعمٰی گوشِ ناشنوا ازو، دیکھیے، ص۸۹۔

۴۹ یہ شعر طبع اول میں شامل نہیں، اس کے بجائے یہ شعر درج ہے: در جہاں ہر فتح از کراڑی است+ آبروئے مرد از خودداری است، دیکھیے، ص۹۰۔

۵۰ طبع اول میں شعر یوں ہے: در عمل مخفی است مضمونِ حیات+ ذوقِ تخلیق قانونِ حیات، ص۹۲۔

۵۱ طبع اول میں مصرعِ ثانی یوں ہے: ہمتش را از مہماتِ عظیم، دیکھیے، ص۹۳۔

۵۲ طبع اول میں شعر یوں ہے: مُدّعی گر صاحبِ قوّت بُود+ دعویٰ یش مستغنی از حُجّت بُود، دیکھیے، ص ۹۵۔

۵۳ طبعِ اوّل میں اسی شعر کا مصرعِ اوّل، دوسرا اور دوسرا، پہلا ہے۔ دیکھیے، ص۹۸۔

۵۴ طبع اوّل میں دوسرا مصرع یہ ہے: قلزمے در قطرۂ مضمر کنم، دیکھیے، ص۹۸۔

۵۵ طبع اول میں پہلے مصرعے میں 'خو' کے بجائے 'خود' کا لفظ آیا ہے، دیکھیے، ص۱۰۶۔

۵۶ طبع اول میں اس شعر کے بعد مزید چار شعر درج ہیں، جو یہ ہیں:

صورتِ منصور اگر خود بیں شوی | ہمچو حق بالا تر از آئیں شوی

سوز مضموں دفترِ منصور سوخت　　جلوہ رقصید و متاعِ طور سوخت
رفت از تن رُوحِ گردوں تاز اُو　　از اجل بیگانہ ماند آوازِ اُو
نعرہ اش در لب چو گویائی ندید　　سر بروں از قطرۂ خویش کشید
(دیکھیے، ص۱۰۶)

۵۷ طبع اول میں اس کے بعد یہ شعر مندرج ہے: پختگیہا جُست وخود آ گاہ شد+ زینتِ پہلوئے بیت اللہ شد، دیکھیے، ص۱۱۱۔
۵۸ طبع اوّل میں اس شعر کا مصرعِ دوم یہ ہے: غوطہ خوار قلزم بُو د وعدم، دیکھیے، ص۱۱۲۔
۵۹ طبع اول میں اس شعر کا مصرعِ دوم یہ ہے: صد شرار از سینۂ خار اپرید، دیکھیے، ص۱۱۶۔
۶۰ یہ شعر طبع اوّل میں یوں ہے: از تو قلزم سائلِ طُو فاں شود+شکوہ سنجِ تنگیِ داماں شود، دیکھیے، ص۱۱۹۔
۶۱ طبع اوّل میں مصرعِ اوّل میں 'محنتِ چِل سالۂ' کے بجائے 'طاعتِ چِل سالۂ' رقم ہے، دیکھیے، ص۱۲۹۔
۶۲ طبع اوّل میں مصرع اوّل کے آغاز میں 'آ گہی' کے بجائے 'آ گہ' لکھا ہے، دیکھیے، ص۱۳۰۔
۶۳ طبع اوّل میں یہ شعر اس شکل میں ہے: حرف ملاّ شمس را حدت فزود+ آ تشے از جانِ تبریزی کشود، دیکھیے، ص۱۳۲۔
۶۴ طبع اوّل میں پہلا مصرع یہ ہے: التہاب دل حسِ ادراک سوخت، دیکھیے، ص۱۳۲۔
۶۵ طبعِ اوّل میں مصرع ثانی یہ ہے: شعلہ ہائے او مثالِ ژالہ سرد، دیکھیے، ص۱۳۶۔
۶۶ طبع اوّل میں اس شعر کے بعد یہ بیت بھی درج ہے: رہنِ مَے عمامہ ہا سجادہ ہا+ پیشِ پائے مَے فروش اُفتادہ ہا، دیکھیے، ص۱۳۹۔
۶۷ طبع اول میں یہ شعر شامل نہیں، دیکھیے، ص۱۴۱۔
۶۸ یہ شعر بھی طبع اوّل کا حصہ نہیں، دیکھیے، ص۱۴۲۔
۶۹ طبع اوّل میں یہ شعر شامل نہیں، دیکھیے، ص۱۴۳۔
۷۰ یہاں سے پورا بند طبع اوّل کا حصہ نہیں، دیکھیے، ص۱۴۵۔
۷۱ طبع اوّل میں اس شعر کا مصرعِ ثانی یوں ہے: برخیالاتِ کہن شبخوں زدیم۔ دیکھیے، ص۱۴۵۔
۷۲ طبع اوّل میں یہ شعر اس صورت میں ہے: عصر نو کز جلوہ ہا آ راست است+ از غبار پائے ما برخاست است، دیکھیے، ص۱۴۶۔
۷۳ یہ شعر طبع اوّل کا حصہ نہیں، دیکھیے، ص۱۴۹۔
۷۴ طبع اوّل میں مصرع اوّل یہ ہے: ما پریشاں چو ہجوم اختریم، دیکھیے، ص۱۴۹۔
۷۵ یہ شعر طبع اول میں شامل نہیں، دیکھیے، ص۱۵۰۔
۷۶ طبع اوّل میں یہ شعر اس صورت میں ہے: آ فتاب از فیض او گردوں مقام+ برقہا محوِ طوافِ او مدام، دیکھیے، ص۸۸۔
۷۷ طبع اوّل کے مصرعِ دوم میں 'تپید ن' کا املا 'طپید ن' اختیار کیا گیا، دیکھیے، ص۱۵۳۔
۷۸ طبعِ اوّل میں اس شعر کا مصرعِ ثانی یہ ہے: در ہجوم عالمے تنہاستم، دیکھیے، ص۱۵۴۔